نظریۂ موت اور قرآن

از مولانا سید ابوالنظر رضوی

(۳)

اس خواب سے جہاں یہ چیز معلوم ہوتی ہے کہ ایک واقعہ پیدا ہونے سے پہلے ہی کائنات پر اپنے نقوش ثبت کر دیتا ہے وہاں یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ نہ صرف واقعہ ہی نقش ہوتا ہے بلکہ اس کے نفسیاتی اثرات و نتائج بھی وجود سے پیشتر نقش ہو جاتے ہیں۔ اگر عمل کوئی مستقل طاقت نہیں تو ان سب حقائق کی کیا تاویل کی جائے گی جو عمل کے وجود سے پیشتر نہ صرف اپنا عکس بلکہ اپنے رنج و مسرت کا اثر بھی سر بستہ پردہ میں ودیعت کر سکتا ہو اس کو اپنے نزدیک گہوارۂ عدم کے سپرد کر کے یہ تصور کر لینا کہ خلود و ابدیت کا کوئی امکان اس میں زندہ نہیں رہا عقل و ہوش سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ میں نے ایک بیداری کا خواب بھی اس ہی نوع کا دیکھا ہے ۱۹۲۷ء میں ایک روز عصر کی نماز با جماعت پڑھ رہا تھا۔ امام میرے وہ ماموں صاحب مرحوم تھے جنھوں نے والدین کے انتقال پر میری تمام بار امداد اور میری تمام تعلیم و تربیت کا انتظام سالہا سال سے اپنے ذمے رکھا تھا اور انتہائی خلوص و ایثار کے تحت۔ نماز کے ہی درمیان میرے دل و دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ماموں صاحب کا انتقال ہو جائے اگر یہ جنازہ پہنچیں ہوں اور اس طرح کہ پاؤں کا انگوٹھا کفن یا چادر سے باہر ہو تو مجھے کتنا رنج ہوگا۔ یہ بیداری کا خواب نماز کے بعد بھی مکان کے دروازہ پر پہنچنے تک رہا۔ پھر ایک دم چونک پڑا اور ایسے وہم و خیال پر خود کو نفرین کرنے لگا لیکن جب اس ہی رات کو چار بجے مجھے یہ بتاتے ہوئے اٹھایا گیا کہ تمہارے ماموں پر فالج گرا ہے اور آواز بند ہو گئی ہے تو

مجھے فوراً بیداری کا خواب یاد آیا اور علاج سے کامیابی کی توقع جاتی رہی۔ علاج کیا اور ہر قسم کا۔ مگر وہ ہی ہوا جس کے لئے کائنات کا قانون فیصلہ کر چکا تھا حتی کہ نزع کے بعد جب ان کے سر و پا پر چادر ڈالی گئی تو وہ ہی دایاں پاؤں کھلا رہ گیا جسے بیداری کے خواب میں دیکھ چکا تھا۔

میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کیا ہے؟ کیا یہ تمام حقائق اس قابل ہیں کہ ان کو یوں ہی ٹھکرا دیا جائے اور کوئی سبق حاصل نہ کیا جائے۔ الارم پیس کی گھنٹی بجنے سے ایک منٹ پہلے بیدار ہو جانے کی توجیہ قوت متخیلہ کی بعض استعدادات کے تحت کی جا سکتی ہے لیکن مذکورہ بالا حقائق کی کیا تاویل ہو سکتی ہے۔ کوئی واقعہ پیش آنے سے پہلے اور پیش آنے کے بعد جبکہ ہمیں کوئی خبر نہ ہو خواب میں اس واقعہ کی بالکل صحیح تصویر دیکھ لینا جیسا کہ میرے ماموں صاحب مرحوم کا ایک واقعہ پیش آیا تھا کیا اس بات کی دلیل نہیں کہ کسی واقعہ کی جو تصویر فضا کی کہربائی لہروں میں جذب ہوتی ہے وہ اتنی کثیف نہیں رہتی جسے ہماری آنکھیں یا نازک آلات ہی محسوس کر سکتے ہوں بلکہ اتنی لطیف ہو جاتی ہے کہ فضائی لہروں سے قوت متخیلہ میں منعکس ہو سکے۔

کیا ہم اس محسوس حقیقت سے معمولی بلند پروازی کے بعد یہ کہنے کا کوئی حق نہیں رکھتے کہ یہ ہی تمام تصاویر اور اعمال و حرکات کے انعکاسات ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے عالم برتر لہ میں بھی

لہ ہو سکتا ہے کہ وہ عالم برتر برق کی لطیف ترین قوت کے عنصر سے ہی تیار کیا گیا ہو۔ کیونکہ عالم مثال کو جس طرح قوت متخیلہ اور حافظہ سے ایک گونہ مشابہت ہے حالانکہ قوت حافظہ ایک ایسی چیز ہے کہ امریکہ کے سائنس داں برقی ٹوپ اڑھا کر برقی لہروں سے چند لمحات میں کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ ایسے ہی تصاویر اعمال کو محفوظ رکھنے والا عالم بھی اگر فضا کی برقی قوت سے مشابہت اور مشاکلت رکھتا ہو تو کوئی انوکھی بات نہ ہوگی۔ اگر آفتاب کی شعاعوں کا ارتقا کرتے ہوئے لطیف سے لطیف تر، غیر محسوس اور نیز قوی تر ہوتے جانا کسی حد تک بنفشی اور ورا بنفشی شعاعوں کی تحقیق سے مشاہدہ میں آتا جا رہا ہے حتی کہ ریڈیو کی شعاعیں قوی ترین ثابت ہو چکی ہیں تو کیا برقی قوت لطیف سے لطیف تر ہوتے ہوئے اپنی استعدادات میں قوی ترین نہیں ہو سکتی۔ کیا سائنس نہیں بتاتی کہ جو کائنات کی ہر وہ حقیقت جو لطیف سے لطیف تر ہوگی کثیف سے قوی تر ہوگی۔ قوت لطافت کا نتیجہ ہے اس لئے لطیف و مجرد حقائق و عوالم کا اپنی تمام استعدادات میں قوی تر ہوتے جانا خود ایک قانون قدرت ہے جسے ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔

(باقی صفحہ ۳۲۷ پر ملاحظہ ہو)

تصورات حافظہ کی طرح تہ برتہ ہوکر جذب ہوجاتے ہیں اور اس ہی طرح قائم ہوجاتے ہیں جیسے صوتی موجات فونوگراف یا ریڈیو اور ٹیلی وژن کی شعاعوں میں۔ نہ موجات بظاہر کسی مصالحہ یا برقی لہروں میں باقی رہ جانے والے ہوسکتے ہیں۔ نہ اعمال کی تصویریں۔ لیکن جب ایک چیز کا مشاہدہ ہے تو دوسری اس ہی جیسی چیز کا امکان کیوں فرض نہیں کیا جاسکتا۔ نہ صرف یہ کہ وہ تصاویر عالم مثال کے آئینہ میں نقش کالحجری ہوجاتی ہیں بلکہ تنویرات مجردہ کی شعاعیں ان کا فلم اس ہی طرح دکھا سکتی ہیں جیسے کہ سینما کا کوئی فلم برقی شعاعیں اور اس ہی طرح آپ ان سے لذت والم کا احساس کرسکتے ہیں جس طرح ایک غمناک (ٹریجڈی) یا تفریحی (کامڈی) فلم سے محسوس کرتے حتی کہ بے تابانہ رونے یا ہنسنے لگتے ہیں لیکن صرف اتنا فرق ہوگا کہ وہ ڈرامہ آپ ہی کی بدبختی یا کامرانی کا ڈرامہ ہوگا اور نہ صرف یہ کہ فلم کی طرح غیر حقیقی نہ ہوگا جیسا کہ حضرت محترم سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی میں عکس اور ظل سے تعبیر کرتے ہوئے ظاہر فرمایا ہے بلکہ خود آپ کی ہستی سے بھی زیادہ حقیقی۔

میں نے ایک دوست سے سنا تھا کہ آب رواں کی موجیں سائنٹفک تحقیقات میں غیر فانی ثابت ہوئی ہیں مگر یقین اس وقت آیا جب مشاہدہ نے بتادیا کہ مختلف سمت کی موجیں بغیر ایک دوسرے سے متصادم ہوئے اور ان کے نشیب و فراز کو زیر و زبر کئے دور تک گذر سکتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ سمندر کی ہر کشتی جو نقوش بناتے ہوئے گذرتی ہے وہ میرے مشاہدہ کے مطابق بھی آدھ آدھ گھنٹہ تک بجنسہ باقی رہتے ہیں حالانکہ دوسرے ہی لمحہ میں فنا ہوجانا چاہئے تھا۔

جب ہر آواز، ہر تخیل، ہر موج، اور ہر وہ حرکت جو کسی ذرہ کو ایک مرتبہ جنبش دینے کا تصور کرچکی ہے۔ فنا نہیں ہوتی تو نیک و بد اعمال ہی میں ایسی کیا خصوصیت تھی کہ وہ زندہ رہتے ہوئے آپ کی مادی،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۲۶) میرا یہ مقصد نہیں کہ حقائق مجردہ حقائق کثیفہ ہی کے جواہر قویہ ہیں اگرچہ یہ ہی چیز زیادہ قرین قیاس ہے اور صوفیاء کے کشف و تحقیق سے قریب تر کیونکہ ایسی چیزوں کے بارے میں ہمیشہ نظریات میں اختلاف ہوجاتا ہے۔ فلاسفہ کی ایک جماعت مسئلہ ارتقاء میں ڈارون کی ہم نوا ہے اور دوسری جماعت کے نزدیک اگرچہ انسان ارتقاء حیوانیت کی آخری کڑی ہے۔ لیکن وہ دیگر حیوانات کے سلسلۂ توالد و تناسل سے علیحدہ مستقل وجود لے کر پیدا ہوا۔ خواہ قانونِ قدرت کے تحت اس کی ابتدائی شکل ایک چھوٹے کیڑے ہی کے مشابہ کیوں نہ ہو۔

اخلاقی، اور تخیلی نتائج کے ذریعہ لذت والم کا باعث نہ ہو سکیں۔

دراصل زندگی کا ہر عمل کتابِ فطرت میں نقش ہو جاتا اور ارتقائی مراحل کے تحت قوی سے قوی تر ہوتے ہوئے عذابِ قبر، عذابِ حشر اور عذابِ جہنم یا نعمہ و جنت کی پاکیزہ لذتوں سے آشنا کرتا رہتا ہے جس کے دوسرے معنی یہ ہی ہو سکتے ہیں کہ وہ زندگی بھی جس سے یہ اعمال پیدا ہوئے تھے فنا نہیں ہوئی۔ ہر عمل کی ابدیت روح کی تجلی اور قانونِ حیات کا ایک جز ہونے کی وجہ سے ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ عمل ابدیت کا مظاہرہ کر سکتا تھا نہ نتیجہ کی تخلیق۔ دنیا نتیجہ کی حقیقت نہیں جانتی وہ جس طرح ہزاروں مصطلحات اور الفاظ بغیر معنی کا کوئی تصور کئے ہوئے استعمال کرتی ہے ایسے ہی نتیجہ کو بھی سمجھتی اور سمجھاتی ہے۔ بہت ہی کم لوگ ہوں گے جنھوں نے اس پر غور کیا ہو کہ جس چیز کو نتیجہ کہا جاتا ہے وہ عمل سے علیحدہ، مختلف اور مستقل حقیقت ہے یا نہیں؟ اگر اختلاف ہے تو کس نوع کا اختلاف ہے اور اگر اشتراک یا اتحاد ہے تو کس نوع کا۔ دراصل عمل اور نتیجہ کی حقیقت ایک ہی ہے نتیجہ عمل کے معنی سے کوئی بیگانگی نہیں رکھتا۔ عمل جب تک اپنی صورت نوعیہ پر رہیگا عمل ہے اور جب صورت مثالیہ اختیار کر لیگا تو اس کو نتیجہ کہیں گے۔

عمل اور نتیجہ کا باہمی تعلق سماوی اور غیر اختیاری ہے عمل بغیر نتیجہ کے اور نتیجہ بغیر عمل کے ممکن نہیں مگر یہ لزوم ایسا نہیں جیسا کہ آتش اور اس کے دخانی اجزا میں ہے، دخانی اجزا ناریت کا کوئی جز نہیں بلکہ چوب خشک کے اجزا ہیں جو آگ کی قوتِ پرواز کے سایہ میں ابھر رہے ہوں بلکہ اس کی مثال پھل اور ان کے درختوں سے دی جا سکتی ہے نتیجہ کو پھل اس لئے کہتے ہیں کہ دونوں میں بہت زیادہ تشابہ ہے۔ کسی درخت کی جب مخصوص استعدادات اور جواہر کوئی مثالی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو ان کو پھل کہا جاتا ہے اور جب تک درخت کی صورت نوعیہ قائم رہتی ہے تو اس کو درخت ہی کہتے ہیں۔ یہی حال عمل اور نتیجہ کا ہے۔ محاورہ میں نتیجہ برآمد ہوا، نتیجہ نکلا بولا جاتا ہے اور معنویت کے لحاظ سے بھی غلط نہیں، کیونکہ اس سے انتزاعی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے جو نتیجہ اور عمل کے درمیان ربط قائم کرتی اور دونوں کی حقیقت کو متحد ثابت کرتی ہے نتیجہ کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں۔

النتیجۃ صورۃ مثالیۃ انتزعت عن العمل وصورتھا النوعیۃ — نتیجہ ایک تمثیلی صورت ہے جو عمل اور اس کی صورت نوعیہ سے نکلی۔

عوام کی زبان حقائق کی ترجمانی کرتی ہے مگر ان کا دل نہیں سلجھتا۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اعمال کے جن نتائج اور صور مثالیہ کو عرفی تعبیرات فرمایا تھا اور مثال و شبح کی نفی کرتے ہوئے اس کی وجہ غالباً وہ ہی نظریہ ہوگا جس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں۔ اگر عوالم اخرویہ کی جزا و سزا اس ہی نوع کی ہو جو عمل و نتیجہ کے درمیان ہم محسوس کرتے ہیں تو اسے نہ خواب و خیال اور مثال و شبح کہا جا سکتا ہے نہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی زید مجدہ کے الفاظ میں "عکس و ظل" بلکہ وہ ایسے ہی نتائج اعمال ہوں گے جن کا تجربہ زندگی کے ہر لمحہ میں دنیائے انسانیت کو ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہیگا۔ موت سے صرف اتنا خوف کیا جا سکتا ہے جتنا کہ ہم اپنی موجودہ زندگی میں اعمال کے نتائج سے کرتے ہیں نہ کہ اس سے مختلف اور شاید خوف مرگ کا فلسفہ اور اصل راز بھی یہ ہی ہو۔ انسان کا ضمیر بہت سی صداقتوں کو محسوس کرتا ہے مگر چونکہ مادی ماحول اور غلط رجحانات اور شعوری تاریکیاں دعوت فراموشی دیتی رہتی ہیں اس لئے وہ اصلی نکتہ کو محسوس نہیں کرتا اور دوسری توجیہات و تاویلات سے مغالطہ میں مبتلا ہو کر طمانیت قلب کی جنت تک پہنچنا چاہتا ہے حتی کہ زندگی کو اس ہی عالم تک محدود کر کے سمجھتا ہے کہ میں نے اس زہر آلود نشتر کا مرہم تلاش کر لیا جو روح کی بے چینی کا باعث تھا۔ قرآن کا کفار سے یہ مطالبہ

فتمنوا الموت ان کنتم صٰدقین — موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو

شاید اس ہی حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لئے کیا گیا ہو۔

ایسے نہ معلوم کتنے حقائق ہیں جنھیں آج تک ہماری نگاہیں مس کر سکیں اور نہ ہمارا تخیل وہاں تک پرواز کر سکا۔ اگر قرآن اور اس کے درس حقائق کو ہم عملی وقار دیسکتے تو سائنس کے اکتشافات کہیں سے کہیں پہنچ چکے اور ان تمام حقائق مجردہ کے مشاہداتی دلائل سامنے لے آئے ہوتے جن کے وجود اور آیات وجود کا قرآن بار بار دعویٰ کرتا ہے۔ مسلمان اگر عقائد اسلامی پر اذعان و یقین نہیں رکھتے تو اس کا گناہ ہمارے ان علماء کی گردن پر بھی رہیگا جو انفس و آفاق پر فکر و تدبر نہیں کرتے

جو سائنس کی تحقیقات کو اہمیت نہیں دیتے جو نجوم، ہیئت، ہندسہ، آثار تاریخی، کیمسٹری، اور تمام علوم جدیدہ کو مذہبی روح کے لئے زہر آلود نشتر سے زیادہ خوفناک سمجھتے اور چند درسی علوم یا وظائف روحانی ہی پر اکتفا کو جائز خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کے عقلی رجحان کا راستہ تبدیل کرنے کے لئے تمام علوم جدیدہ میں زیادہ سے زیادہ شغف کی ضرورت تھی تاکہ مذہبی حقائق کو مشاہدات و آیات کی روشنی میں تابناک بنایا جا سکتا۔

قرآن نے ہر جگہ علوم مادی اور علوم روحانی کی تحصیل پر زور دیا ہے لیکن علماء نے سب سے پہلے علوم مادی کو ٹھکرایا پھر علوم روحانی میں سے مشاغلِ تصوف کو جو کشف و الہام کے ذریعہ ایمان کی تنویرات سے قلب و روح کو معمور کر دیا کرتے تھے ترک کر کے درسِ حدیث و فقہ پر ہی توجہات وقف کر دیں حالانکہ ان کو غور کرنا چاہئے تھا کہ جو مسائل محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے دور میں کوئی شبہ نہیں پیدا کر سکتے تھے آج کیوں شبہات سے لبریز ہو گئے۔

یہ کشف و الہام، وحی و خوارق اور خوابہائے بیداری ہی تھے جن کے عینی مشاہدات ہر غیب کو عالمِ شہادت کا رنگ دے رہے اور ایمان و یقین میں مسلسل اضافہ کر رہے تھے۔ بدقسمتی سے یہ نعمت بھی بڑی حد تک امتِ محمدیہ سے چھن گئی اور ایسے علماء بھی نہ پیدا ہو سکے جو سائنٹفک تحقیقات کرتے اور ان ہی کو آیاتِ الٰہی کے طور پر پیش کر سکتے۔ ہوا، بادل، کواکب و سیارات، فضا، طبقات الارض، وحشی اقوام، اقوام ماضیہ، تحلیل و ترکیب و اجزاء، معدنیات، اور ان کے کہربائی موثرات، نباتات اور ان کی گوناگوں انواع، پھر ان کے احساسات و اعمالِ انسانی، حیوانات اور ان کی ارتقائی تاریخ ان کے اقسام اور ان کا فلسفہ، انسان اور اس کی ہر گونہ استعدادات، اس کے جذبات کی دنیا، خیالات کی دنیا، اس کے علوم و ادراکات۔ غرض یہ کیا کیا کچھ تھا جس پر تدبر کرنا قرآن کی صحیح تفسیر کا راستہ صاف کر سکتا تھا۔

کیا جس وقت ٹیلی وژن کی تحقیق نہ ہوئی تھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ دنیا کا ہر شخص اور اس کا ہر عمل کائنات کی فضا کے ہر اُس ناقابلِ تجزیہ حصہ میں منعکس ہو چکا ہے جس کا تصور کیا جا سکے اور اس طرح

کوئی معمولی شخص اور اس کی معمولی حرکت بھی بے معنی نہیں۔ بلکہ ساری کائنات میں ایک زندہ حقیقت کی طرح موجود اور اس کی ہر فاعلہ اور منفعلہ قوت پر اثر انداز ہو کر زندگی کی تعمیر و تخریب کر رہی ہے اور ہزاروں میل پر رہنے والے لوگ قوت متخیلہ کی عکس پذیری سے اس نیک و بد عمل کی تحریک کو جذب کر رہے ہیں جس کی خبر ان کو قیامت تک بھی نہ ہو سکتی۔ حضرت عمرؓ نے میدانِ جنگ کا نقشہ اور اس کا عکس دیکھکر "یا ساریۃ الجبل" فرمایا اور سب صحابہ نے سن لیا۔ کل تک یہ ایک کرامت اور خرق عادت تھی لیکن آج انسانی ریڈیو اور ٹیلی وژن کا زندہ ثبوت ہے۔

انسان کے آلاتِ سمع و بصر اگر روحانی ریاضتوں اور مجاہدات کے ذریعہ نازک تر ہو جائیں تو وہ خود ریڈیو اور ٹیلی وژن ہو سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے آلاتِ بصر نے ٹیلی وژن کا کام دیا اور صحابہؓ کے آلاتِ سمع نے ریڈیو کا۔ اور یہ کوئی خرقِ عادت نہ تھی، ہر شخص خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو یہ خصائص پیدا کر سکتا ہے۔ جوگیوں اور سنیاسیوں کے ایسے قصے بھی آپ نے سنے ہوں گے جن منکرین اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ کوئی کرامت خرق عادت نہیں بلکہ ہمارا ایسا خیال کرنا قوانین فطرت سے ناواقفیت کی دلیل ہے وہ غلط نہیں۔ حقیقت یہ ہی ہے اور اس ہی وجہ سے ائمہ صوفیہ کرامات کو شعبدہ بازی سے زیادہ کوئی وقعت نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک زندگی کا صراطِ مستقیم سے معمولی انحراف نہ کرنا ہی سب سے بڑی کرامت ہے اور اس قسم کی کرامات جو انسان کے دماغی اضمحلالات سے فائدہ اٹھانے کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ انسانی عظمت و برتری کے ثبوت میں پیش کرنا جائز نہیں۔

قرآن نے دعویٰ کیا تھا کہ

من[1] قتل مومنا فکانما قتل	جس نے ایک مومن کو قتل کیا پس گویا ساری
الناس جمیعا۔	کائناتِ انسانی کو قتل کر دیا۔

لیکن اس کی کوئی دلیل ہمارے علماء کے پاس نہ تھی اس لئے قرآنی دعویٰ کی وقعت زورِ قلم کے

---

[1] ایک دوسری جگہ قرآن نے مومن کی بھی تخصیص نہیں کی۔ بلکہ من قتل نفسًا بغیر نفسٍ و فسادٍ فی الارض" فرمایا ہے جس سے میرے عمومی تصور کو زیادہ مدد مل سکتی ہے۔ (ابوالنظر رضوی)۔

زیادہ قائم نہ ہو سکی۔ اور سارے جہان کو قتل کرنے کا مطلب خدا کے نزدیک زبردست گناہ ہو نالے لیا گیا۔ اُفٍ لکم ثم اُفٍ لکم۔ وہ شخص جس کا دل و دیدہ ایمان کی تنویرات سے روشن، جس کی رگ رگ تجلیات سے معمور اور جس کی زندگی سراپا حق و صداقت ہو کر رہ گئی ہو، اس کا وجود اس کا ہر عمل، اس کا ہر اشارہ، اس کی ہر نگاہ بلکہ یوں کہیے کہ زندگی کا ہر پہلو فضائے بسیط کی برقی لہروں اور دیگر لطیف ترین قوتوں میں جذب ہو کر ساری کائنات کے لئے ایک رحمت اور برکت ہے دنیا کا کوئی گوشہ اس سے براہِ راست واقف ہو یا نہ ہو مگر اس کی برکات، اس کی نورانیت، اور اس کے نقوشِ حیات جذب کر سکنے سے محروم نہیں۔ اس کا ہر نیک عمل، اس کی ہر آوازِ حق و صداقت اس کا ہر پاک تخیل دنیا کو دعوتِ حق اور پیغامِ صداقت دیتا ہے۔ اس کو قتل کر دینے کے معنی دنیا کو سرچشمۂ خیر اور طوفانِ حیات میں منارۂ روشنی سے محروم کر دینا ہے۔

لوگ عام طور پر قرآن کی اس حقیقت آفرینی کو استعارہ، مثال، تشبیہ وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ عمل اور اس کی زندہ قوتوں کا احساس رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ شاعری اور ادبِ لطیف کا کوئی جز نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے جس کا اندازہ الٰہیاتی حقائق کے احساسات سے ناآشنا ہونے پر طبیعاتی تحقیقات سے بھی ہو سکتا ہے۔ آج ہمارے علماء نہ ان روحانی حقائق پر تدبر کرتے ہیں جو محققینِ صوفیہ کے کشفیات میں داخل ہیں نہ اہلِ سائنس کی ان نازک تحقیقات سے بہرہ یاب جن کا ہر برق پارہ خدا کے وجود، اس کی عظمت اور اس کی آمریت پر گواہی دے رہا ہے کاش داعیانِ اسلام ادھر متوجہ ہو سکتے!!

کہا جا سکتا ہے کہ جب ہر عمل کائناتِ انسانی ہی نہیں بلکہ مجموعی کائنات میں جذب ہو کر اثر انداز ہوتا ہے تو قتل ہی میں وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی بنا پر قرآن نے اس ہی کا انتخاب کیا۔ لہذا یہ بھی یاد رکھئے کہ انسانی دماغ کچھ اس نوع کا واقع ہوا ہے کہ وہ اذیت کی انتہائی صورت یعنی قتل تک کو وقتی مقامی اور مخصوص ماحول تک محدود سمجھتا ہے۔ تا بدیگراں چہ رسد۔ اس لئے قرآن نے نہ صرف قتل کی اس اہمیت کو دیکھتے ہوئے بلکہ اس بنا پر بھی کہ کسی ارتقا کی آخری شکل کو

خواہ وہ ارتقاراذیت ہی کیوں نہ ہو پیش کردینا درحقیقت اس کی تمام ابتدائی اور درمیانی کڑیوں کو پیش کردینے کے مترادف ہوتا ہے۔ "مثقال ذرۃ" کی اہمیت کو محسوس کرنے کے باوجود صرف قتل کے قتلِ عام کو پیش کرتے ہوئے بتادیا کہ کسی عمل کو محدود تصور کرنا غلطی ہے۔ ہر عمل کائنات کے ہر ذرہ اور ہر طاقت پر اثرانداز ہوتا اور زندگی کی لائن تبدیل کرسکتا ہے۔ ہر گناہ خواہ وہ کسی قسم کا کیوں نہ ہو ایک قتل ہے، اخلاق کا قتل، محبت و وفاداری کا قتل، شرافت واخوت کا قتل، دیانت وصداقت کا قتل، نظم واجتماعیت کا قتل، سنجیدگی اور رواداری کا قتل، غرض یہ کہ نیکی جس کا نام ہے وہ حیات، تخلیق اور نشوارتقار کی ضامن ہے اور گناہ مرگ وفنا کا علم بردار۔ ہر نیکی ایک حیات کی تخلیق یا ایک خلق وحیات کو ہر گونہ امدادِ ربوبیت سے نشوونما دیتی ہے اور گناہ کسی نہ کسی اخلاقی، نفسیاتی، ذہنی حقیقت کو موت دیتا ہے۔ نیکی ایک تعمیر ہے اور گناہ ایک تخریب وہ زندگی ہے یہ موت، نیکی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ اور گناہ موت کا اجارہ دار لہٰذا یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ قرآن نے قتل کا انتخاب کرکے دوسرے گناہوں کو چھوڑ دیا۔ اس نے تو گناہ کا صرف وہ پہلو انتخاب کیا ہے جس کا کھلا ہوا نتیجہ موت تھا۔ ورنہ ہر وہ گناہ جس کی موت نگاہوں کو محسوس نہ ہو، ایک قتل ہے۔ اور قرآن کے نزدیک ساری کائنات پر اثرانداز ہونے والا۔ قرآن نے شہدار کے بارے میں "بل احیاء" کی شہادت سے اس ہی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب نیکی زندگی کی ضامن ہوگئی اور شہدار کے اعمال حسنہ ہنوز زندہ اور برسرعمل ہیں تو پھر اس مادی زندگی کے اعتبار سے بھی کیونکر ان کی زندگی کو موت کے آغوش میں دیا جاسکتا تھا۔ زندگی اگر چند سانسوں اور دورانِ خون کا دوسرا نام نہ تھا تو وہ نہ صرف تشخص انسانی اور ادراک و احساس کے اعتبار سے دامنِ ربوبیت سے وابستہ ہے بلکہ کائنات میں زندگی کی برقی قوتیں جذب کرتے رہنے کے اعتبار سے بھی باقی ہے اور باقی رہے گی۔

شہدار کی حیاتِ مادی اور حیاتِ مجرد ثنائیات کی نوع سے نہیں جیسا کہ مولانائے محترم سید سلیمان صاحب ندوی کا گمان ہے بلکہ یہ بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ قرآن حقائق کا ترجمان ہے

شعراء کی مثالیات سے اسے کیا نسبت؟ قرآن کی مثال بھی ایک حقیقت ہوتی ہے خواہ عوام کو اس سے حقیقتِ کاملہ کا احساس نہ ہو سکے۔

لا یستحی ان یضرب مثلاً[1]	خدا ایک مچھر بلکہ اس سے چھوٹی چیز کی مثال
ما بعوضۃ فما فوقھا۔	دینے سے بھی نہیں شرماتا۔

کا فلسفہ بھی یہی ہے اگر مثال خود ایک حقیقت نہ ہوتی تو شعراء کی طرح اس کو بھی پست و ذلیل امثلہ کی بجائے بہتر امثلہ کا حسن کلام کے لئے انتخاب کرنا پڑتا۔ لیکن چونکہ وہ صرف ایک نئی حقیقت پیش کرنا چاہتا ہے اس لئے اس کو ان مراعات کی احتیاج نہیں جو حسن شعری میں اضافہ کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکتی ہوں۔ دوسرے قرآن جہاں مثال دیتا ہے وہاں مثال اور حقیقت کے درمیان تشابہ نہیں پیدا ہونے دیتا بلکہ اس کے دعاوی اور ان کا سیاق و سباق صاف بتاتا ہے کہ مثال ہے یا حقیقت علماء کی جس جماعت نے ظواہر آیات کو تمثیلات پر محمول کر کے تاویل کا راستہ اختیار کیا ہے میں اسے دیانتدارانہ غلطی، پاکبازانہ گناہ اور اجتہادی بے راہ روی سے زائد کچھ نہیں سمجھتا۔

قرآن کی حقائق نوازی کا درست اندازہ کر سکنے کے لئے جتنی روحانی لطافت و علویت، ذہنی تکمیل و ارتقاء حس نازک اور پاکیزگی، یا جس قدر طبیعاتی، کیمیاوی اور دیگر علوم و معارف کی تحقیقات ہونا چاہئے وہ اس سے بہرہ یاب نہ تھے اور دوسروں کے قلب و دماغ کو تسکین دینے کی غرض سے انھوں نے تاویلات کا سنگِ بنیاد رکھا۔ بہرکیف کچھ ہی کیوں نہ ہو علماء اسلام نے علم و فن کا ایک ایسا خاص محور اور حدود مستقر تلاش کر لیا تھا جس سے وہ کسی طرح دور نہ ہو سکے۔

اگرچہ مجھے یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کہ سیاسی انقلابات، تمدنی تعمیر و تخریب اور اجتماعی نظامات کے گوناگوں تغیرات نے بھی ان کو مسلسل انہماک کا موقعہ نہیں دیا اور اس بنا پر وہ صدہا علوم و فنون کے موجد و مخترع تو ہو گئے لیکن ان کو فروغ نہ دے سکے۔

---

[1] مچھر کی اگر ساخت، عادات، معیشت و معاشرت وغیرہ پر غور کیا جائے تو باوجود اتنا حقیر ہونے کے ایک دنیائے ہوئے ثابت ہوگا یہ ہی وہ حقائق ہیں جن کو دنیا نہیں جانتی اور اس لئے ایسی مثالوں کو وقعت نہیں دیتی (ابوانظر رضوی)

مگر باوجود اس کے یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ انھوں نے اس نقطۂ پرواز تک رسائی حاصل نہیں کی جس کی حقائقِ اسلامیہ کو ضرورت تھی اور جو مغربی قوموں کے لئے علمِ الٰہی مخصوص کر چکا تھا۔ نہ صرف اتنا ہی ہے بلکہ آج بھی ایسے علماء اور محققین اسلام بہت ہی کم ہیں جو جدید تحقیقات سے اسلامی تبلیغ کی سہولتیں فراہم کر کے دنیا کو دعوتِ حق دے سکتے ہوں۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا سید سلیمان ندوی، پروفیسر محمود علی کپورتھلہ، مولانا سعید احمد صاحب ایم اے پروفیسر شن کالج دہلی وغیرہ کو یہاں فراموش کر دینا اخلاقی گناہ ہوگا۔ سید صاحب موصوف کے صرف خطباتِ مدارس ہی میرے نزدیک ان کی نجات کے لئے کافی ہیں، چاہے سیرۃ النبی کی کوئی ایک جلد بھی مرتب نہ کر سکتے میری زندگی میں وہ خطبات ہی پہلی چیز ہیں جس نے میرے دل کو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ عظمت سے معمور کر دیا تھا۔

ایک مسئلہ سے دوسرا مسئلہ چھڑتا جا رہا ہے۔ بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ کہنا یہ تھا کہ موت تشنجی، تنفسی اور تخیلی اذیتوں کے لحاظ سے بھی نیند سے مشابہت رکھتی ہے اور صورِ مثالیہ عرفیہ سے لذت والم جذب کرنے کے اعتبار سے بھی جس طرح نیند کا تصور کبھی لذت وشیرینی کے احساسات بیدار کرتا ہے اور کبھی جمالیات کا بے تابانہ شوقِ دید ہونے پر نیند ناخوشگوار محسوس ہونے لگتی ہے ایسے ہی موت میں نہ کوئی غم ہے نہ لذت بلکہ سازِ مرگ جذبات کے جیسے نغموں کو چھیڑ رہا ہوگا۔ موت بھی اس ہی رنگ میں محسوس ہوگی۔ انسانی فطرت کا یہ نفسیاتی نکتہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ وہ جس ماحول کے درمیان اور جن چیزوں سے وابستہ ہو کر ایک عرصہ تک زندگی گذار چکی ہوگی۔ اس سے بغیر طبعی محبت کئے نہیں رہ سکتی۔ اس ماحول سے علیحدگی اور ان اشیاء کی تخریب خواہ تعمیر ہی کے لئے کیوں نہ ہو اس کو ہرگز گوارا نہیں ہو سکتی جن میں وہ ایک مدت تک رہ چکی ہو۔

اس معاملہ میں موت یا زندگی کے کسی انقلاب کی کوئی تخصیص نہیں دونوں سے یکساں تاثرِ غم ہوگا۔ رہی تاثر کی کمی بیشی وہ علیحدگی، مدت اور جذبات کی والہانہ دلچسپیوں کے کم وبیش ہونے پر موقوف ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نیند یا زندگی کے کسی دوسرے انقلاب میں کوئی

ایسی طبعی کشش تھی کہ اذیت محسوس نہیں ہو سکتی۔ اور موت میں کوئی ایسا "دشنہ پنہاں" تھا جو لذت کا خواب بھی نہیں دیکھنے دیسکتا۔

انسانی نفسیات کا علم آپ کو بتائے گا کہ ہر گونہ لذت والم لیلائے وجدان ہی کی چشمہائے ناز کا نتیجہ ہے اور بس۔ نہ موت میں کوئی زہر ہے نہ زندگی میں کوئی تریاق۔ قومی فوج کے سپاہی، فلاسفہ صوفیاء، مجاہدین اور انبیاء یا غم زندگی سے تنگ آئے ہوئے جس موت کو بوسہ دینا سب سے بڑی عزت، سب سے بڑی خوش قسمتی اور سب سے بہتر سکون محسوس کرتے ہیں اس ہی موت کو ایک کافر، ایک گنہگار، ایک دہریہ اور ایک بزدل سب سے بڑی خوفناک چیز سمجھتا ہے یہ کیا ہے؟ انسانی فطرت کی وہ نفسیاتی بھول بھلیاں جس نے حقائق کی دنیا کو ایک معمہ بنا دیا۔

موت سے خوف کرنا ایک ایسی حماقت ہے جو انسان کی ذہنی اور نفسی حیات کا ایک جز ہو کر رہ گئی ہو۔ لیکن یہ اس ہی وقت تک ہے کہ انسان اس مادی ماحول کو ٹھکرا کر یہ محسوس کرنے کی جرأت نہ پیدا کر سکے کہ انسان کیا چیز ہے؟ اس کی کیا اہمیت ہے اس کے استعدادات کیا ہیں اور وہ کوئی ایسا جوہر رکھتا ہے یا نہیں جو ثبات و دوام کی جنت پہلو میں لئے ہو۔

یہ حقائق فلسفہ اور سائنس کی روشنی میں سمجھے جا سکتے ہیں۔ محسوس نہیں ہو سکتے مشاہداتی احساس کی دولت حاصل کرنے کے لئے آپ کو اس تصوف و روحانیت کی دہلیز پر جھکنا پڑے گا جس کو مادی تمدن کا ہر ذرہ ٹھکرا چکا ہے اور کیوں نہ ٹھکرائے۔ جب نور ایمان کی ایک قندیل بھی روشن نظر نہ آتی ہو تو گم کردہ راہ کو نے شعلۂ طور سے اپنا راستہ پا سکتا ہے۔ علماء کی ہر تبلیغی سعی و جہد اس لمحہ تک معنویت سے تہی دامن رہے گی جب تک کہ وہ موت اور عالم اخروی کے حقائق کا مشاہدہ کر کے قلبی اذعان و یقین کے سایہ میں دنیا کو زندگی کی اس شاہراہ پر گامزن ہونے کی دعوت نہ دیں گے جو انسان کے ہر اختراعی نظریہ سے زیادہ کامیاب زندگی تک پہنچانے والا ہے۔ خواہ وہ نظریۂ جمہوریت ہو یا شہنشاہیت، آمریت ہو یا اشتراکیت۔ کائناتِ انسانی کی قوتِ متخیلہ کو معمول بنا سکنے کے لئے اس کہربائی قوت کی ضرورت ہے جو ایمان کی شعاعیں پیدا کیا کرتی ہیں جب تک

مبلغین اور داعیانِ اسلام میں وہ دل نہ ہوگا جسے ایمان کا برقمہ کہا جاسکے اس وقت تک نہ موت کا خوف دور کیا جاسکتا ہے نہ ایمان بالغیب کا کوئی امکان۔ اور جب تک یہ چیزیں نہ ہوں نہ مسلمان سچا مسلمان ہوسکتا ہے نہ اس حکومت واقتدار کا مالک جو دنیا کی دوزخ کو جنت بنا سکے ہر شخص موت سے صرف اس خیال کی بنا پر خوف کرتا ہے کہ اس کا وہمی نہیں بلکہ حقیقی وجود یا تو ہمیشہ کے لئے فنا ہوجائے گا یا ایسی مجرد زندگی نصیب ہوگی جسے خواب وخیال سے تعبیر کیا جاسکے اور یہ دونوں صورتیں قریب قریب یکساں حیثیت رکھتی ہیں حالانکہ وہ لوگ جو دوسرے عوالم کو دیکھ چکے ان کا ادراک واحساس کرچکے اور ہر وہم وظن سے بالاتر یقین حاصل کرچکے ہیں ان کے نزدیک یہ وجود وہمی ہے اور جو بیداری، زندگی اور وجود موت پر نصیب ہوگا وہ موجودہ زندگی سے کہیں زیادہ حقیقی ہوگا۔ قرآن بھی اس کو "لھی الحیوان" اصل زندگی کہتا ہے مگر یہ سب وہ باتیں ہیں جن کے کہنے والے مرچکے اگر آج قرآن کے دعوے پر روحانی مشاہدات کے ذریعہ یقین رکھنے والے تبلیغ اسلام کے لئے پیدا ہوجائیں تو قرونِ اولیٰ کا وہی سنہری دور واپس آسکتا ہے جس کی تمنا ہر مسلمان کو ہوگی۔

نزع اور نظارۂ برزخ موت پر بحث کرتے ہوئے مجھے اس نازک اور پیچیدہ مسئلہ کو بھی چھیڑنا پڑے گا جس کا تذکرہ ہمارے مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے سیرۃ النبی جلد چہارم صفحہ ۹۰۶ پر فرمایا ہے۔ مولانا کی تحقیق یہ ہے کہ عالم برزخ کے مناظر نزع کے وقت نظر آتے ہیں چنانچہ انھوں نے آیات اور مفسرین کے بعض اقوال کو شہادت میں پیش فرمایا ہے لیکن میں بصد ادب اختلاف کرنے کی اجازت چاہوں گا میرے نزدیک یہ درست نہیں اور یہ چند وجوہ۔

(۱) بحیثیت طبیب اور بحیثیت دوست یا عزیز ہونے کے عالم نزع کی آخری ہچکیوں تک مجھے ٹھیرنے کا بارہا اتفاق ہوا ہے لیکن میں نے مرنے والے کی زبانی کوئی ایسی بات آج تک نہیں سُنی جو عالم برزخ کے بعض مناظر پیش آنے کی شہادت دے سکتی نہ کسی دوسرے صاحب سے ایسی چیز سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ عالم سکرات چونکہ گفتگو کا موقعہ نہیں دیتا اس لئے

معلوم نہ ہو سکا ہو گا کیونکہ آخری ہچکیوں تک کبھی ہلکی آواز اور کبھی اشارہ سے بات کرتا رہا ہوں۔ مجھے طبعی طور پر دوسری دنیا کا حال معلوم کر سکنے کا شوق جنون کی حد تک رہا ہے اور اس لئے میں نے نہایت احتیاط سے ہر سانس ہر اشارہ اور ہر انداز سے یہ محسوس کرنے کی کوشش کی کہ آیا مرنے والے کو عالم بالا کی کوئی حقیقت تو نظر نہیں آرہی مگر نتیجہ ہمیشہ صفر ہی رہا۔

چنانچہ ایک زمانہ میں انھیں مشاہدات کے بھروسہ پر مجھے عالم آخرت کا وجود مشتبہ نظر آنے لگا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ ایسے مشاہدات کو غلط ثابت کرنے کے لئے پہلو نکل سکتے ہیں لیکن جس نے "اذا بلغت الحلقوم" تک کوئی پتہ نہ پایا ہو وہ بمشکل ہی تاویلات سے دل کی پیاس بجھا سکیگا۔ بعض مرنے والوں کو مردہ احباب واعزہ اور بعض کو عجیب وغریب اشکال ضرور نظر آتی ہیں لیکن اگر آپ غور کریں گے تو وہ حافظہ کی فوٹو گرافی اور اضمحلال دماغی کے بھیانک مناظر سے زیادہ علی العموم کچھ نہ ثابت ہو گا۔

(۲) عالمِ نزع آخرت کے منازلِ اربعہ کا کوئی جز نہیں نہ قرآن نے اس کا دعویٰ کیا نہ محققین صوفیا ہی اس کے موید ہیں۔ نزع اور اس کی تمام اذیتیں ان ہی قوانین کے تحت ہوتی ہیں جو کائنات کے ہر ذرہ پر نافذ ہیں۔ نزع میں کوئی ایک تکلیف بھی ایسی نہیں ہوتی جسے عذاب اخروی سے نسبت دی جا سکے۔ لہذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نزع منازلِ آخرت میں سے کوئی منزل نہیں جب ایسا ہے تو پھر عالم برزخ کے مناظر ان ہی آنکھوں سے نظر آنے کے کیا معنی؟ روح جب تک اس مادی کثافت سے باہر نہیں آجاتی اسے عالمِ برزخ کا کوئی نظارہ کیونکر محسوس ہو سکتا ہے جسمانی اذیت خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو محض اذیت ہونے کے اعتبار سے ہرگز روحانیت کے حقائق ومناظر کو پیش نہیں کر سکتی جن آنکھوں کو ہمارے چہرے، ہمارے درودیوار اور ہماری زمین وآسمان نظر آرہا ہو، انھیں دوسری دنیا کیسے نظر آسکتی ہے۔ تشنجی، تنفسی اور تخیلی اذیت نہ عالم برزخ سے کوئی مناسبت رکھتی ہے، نہ اس کی نیم بیہوشی۔ ہر تکلیف میں ہوش وحواس پر اثر پڑتا ہے اور خصوصاً سخت تکلیف پر۔ لیکن کیا وہ بیہوشی برزخ کے پردے اٹھا سکتی ہے۔

موت ہمیشہ اذیت کے سایہ میں نہیں ہوتی۔ کمزور اور پرانے مریضوں کی روح علی العموم نہایت جلد اور نہایت سہولت سے نکل جاتی ہے، نہ ان پر سکرات کا عالم طاری ہوتا ہے نہ غرات کی گہرائیوں میں وہ ڈوبتے ہیں۔ اور اگر کچھ ہوتا ہوگا تو ایسا جسے عالم نزع کی اہمیت سپرد نہیں کی جاسکتی ایسی حالت میں آخر وہ کیا چیز ہے جو پردے اٹھا سکتی ہو؟ کیا وہ طاقت موت ہے؟ موت کے کیا معنی موت کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی۔ خواہ عالم مثال میں اس کی کوئی شکل ہو لیکن اس عالم آب وگل میں ان علامات و آثار ہی کا دوسرا نام موت رکھا جاتا ہے جو اذیت اور بیہوشی سے ترکیب پاتے ہیں لہٰذا موت میں کوئی ایسی کشش تسلیم کرنے سے انکار کی اجازت ہونا چاہئے جو برزخ کے مناظر دکھا سکے۔

(۳) روح اس عالم رنگ و بو میں حیات و نمو کے ایک ایسے قانون کا نام ہے جسے ہمارے علم و اطلاع سے قطعاً باہر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یورپ کے ڈاکٹر نہ دل کی حرکت کو سالہا سال تک باقی رکھ سکتے نہ اس شخص کو جو نزع سے گذر کر موت کے آغوش میں پہنچ چکا ہو دوبارہ کچھ عرصہ کے لئے زندہ کیا جاسکتا، نہ اس قسم کے صدہا معجزات سائنس و کیمیا کی ساحری سے دکھائے جاسکتے تھے۔ روح اس عالم میں بخارات لطیفہ، قوت مدبرہ اور نسمہ کا نام ہے اور یہاں تک کہ ہم

لہ خواہ دوسرے عالم میں اس کی کوئی حقیقت، شکل اور نوعیت ہو اور اس روح سے جس کو روح طبعی کہا جاتا ہے نفس ناطقہ یا روح انسانی (جو روح طبعی کی ہیئت مجردہ ہے) کسی قسم کا ربط و تعلق کیوں نہ رکھتی ہو۔

سے یہاں یہ مغالطہ نہ ہونا چاہئے کہ جب دونوں ارواح ایک ہی حقیقت کی دو تصویریں ہیں تو کسی زندگی میں ان کے جمع ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر ایک کو اپنے اپنے عالم تک محدود رہنا چاہئے۔ حالانکہ محققین صوفیا کا نظریہ ہے کہ بعد موت نسمہ بھی روح انسانی کے ساتھ مربوط رہیگا۔ اس کے معنی یہ ہی ہوسکتے ہیں کہ دونوں ارواح جداگانہ حقائق ہیں نہ کہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو۔

کیونکہ اول بقائے نسمہ کے معنی صرف اس کے توائے باطنہ کا وجود ہے جو باوجود لطیف تر ہونے کے محض مادہ سے خلق ہونے کی بنا پر مادی کہے جاسکتے ہیں ورنہ نسمہ کے وہ تمام اجزا ترکیبی ہرگز باقی نہیں رہیں گے جن کی حیات نو بہ لوازمی وسائل کی محتاج تھی۔ لہٰذا جب قانون مادی کی زائیدہ روح طبعی اپنی اصل شکل میں نہیں رہی تو یہ اعتراض نہیں پڑ سکتا۔ وہ روح ہی کہاں رہی۔ اس کے بعض خواص و قویٰ باقی رہ گئے۔ دوسرے خود صوفیا ہی کے نزدیک کوئی زندگی پچھلی زندگی کے بعض جواہر حیاتیہ کو قانون ارتقا کے مطابق پہلو میں لئے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اس لئے اگر ارواح طبعی اور نسمہ حیات مادی کا ضروری جزو یا جوہر ہونے کے لحاظ سے باقی رہ جائے تو یہ خود تخلیقی قوانین کا احتیاج ہوگا نہ کہ بغیر ضرورت احتیاج دوگونہ حیات و روح کا باہمی ربط و اتصال۔

عام حالات میں موت وحیات کے کسی پہلو سے روحِ مجرد کا وجود تک نہیں محسوس کر سکتے۔ خواہ اندازہ کر سکتے ہوں۔ اس نشأۃ دنیاویہ کی یہ خصوصیت ہے اور اس ہی لئے ایمان بالغیب پر زور دیا گیا۔ موت ہو یا زندگی تعمیر و تخریب کے اس ہمہ گیر قانون سے بالاتر پرواز نہیں کر سکتی جو قدرت نے ہماری حیاتِ مادی کے لئے تجویز کر دیا تھا۔ عالمِ برزخ کے مناظر دیکھ سکنا اس عام قانون کے خلاف ہے نہ کسی نے وہ مناظر دیکھے نہ دیکھ سکتا ہے تا آنکہ مجاہدات، ریاضیات اور اعمال و وظائف کے ذریعہ وہ اپنی خفتہ استعدادات کو بیدار کر کے ان لطیف و مجرد عوالم سے ربط نہ پیدا کرلے جہاں روح ایک دوسرے قانون کے تحت نئی ہیئت اختیار کر لیتی اور مخفی استعدادات سے زیادہ کام لے سکتی ہے۔ موت سے یہ توقع قائم کرنا کہ وہ حیاتِ مادی کے قانون سے اس آخری سانس تک جو اس دنیا کی فضا میں لیا جا رہا ہے، قلب کے اس قبض و بسط تک جو سینہ میں تلاطم پیدا کر رہا ہے اور خون کے اس دوران تک جو رگ و پے میں آتشِ سیّال کی لہریں دوڑا رہا ہے انسان کو آزاد کر کے نئی دنیا کے مناظر سامنے لا سکتی ہے غلط ہو گی اور یکسر غلط۔

اگر اس زندگی کی موت بھی کچھ مناظر دکھا سکتی تو آپ دنیا کو آج سے بہت کچھ مختلف پاتے۔ انسان جب تک اس زندگی کا ایک جزء ہے اس وقت تک وہ صرف اتنا ہی دیکھ سکتا ہے جتنا کہ قانونِ قدرت نے اس کو اجازت دی ہے۔ موت کائناتِ مادی کا ایک تخریبی قانون ہے اور اس کائنات کا کوئی قانون مادی قوتوں سے زیادہ لطیف، عمیق اور علوی نہیں ہو سکتا۔ نزع میں ہرگز یہ استعداد نہیں کہ قانونِ مادی کی گرفت سے ایک لمحہ کے لئے بھی آزاد کر سکے صرف موت کی تاریکیاں ہی پائندہ تابناکیوں کو آغوش میں لے سکتی ہیں اور کوئی چیز نہیں۔

(۴) قرآن کی جن آیات سے نزع میں برزخ کا علمِ یقین ثابت کیا گیا ہے ان پر روشنی ڈالنے سے قبل بطورِ تمہید ایک نکتہ عرض کرنا چاہتا ہوں جس کے بعد میرا نظریہ واضح تر ہو جائے گا۔

موت تمام اضافاتِ حیاتیہ کا انقطاع کر کے سکون و طمانیتِ قلب کا باعث ہوتی ہے یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے جس لمحہ تک زندگی اور موت کی کشمکش مرنے والے کے ذہن میں جاری

رہتی ہے وہ دوگونہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے لیکن جب زندگی کا کوئی بعید ترین امکان بھی باقی نہیں رہتا تو وہ تمام توجہات اور تخیلی شعاعوں کو سمیٹ کر اس مرکز پر جمع کر دیتا ہے جس کو موت کہتے ہیں اس وقت مرنے والے کی ہر بات اور ہر حرکت میں ایک سکون و طمانیت ہوتی ہے۔ اور ایسی طمانیت جو اس سے پہلے اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ وہ تمام آرزوئیں، وہ تمام جذبات اور وہ خیالات جو اُسے ضمیر کی آواز نہ سننے، سچائیوں کو تسلیم نہ کرنے اور حقائق کو محسوس نہ کرنے کے لئے مجبور کیا کرتے تھے تاکہ مادی زندگی کو عیش سے گذارا جا سکے۔ سب کے سب دفن ہو جاتے ہیں اور اب وہ ضمیر کی ہر آواز، روح کا ہر نغمہ، اور انسانی فطرت کا ہر مطالبہ گوشِ ہوش سے سننے کے لئے ہمہ تن آمادہ ہو جاتا ہے اور یہ آمادگی ان تمام تہ برتہ پردوں کو اٹھانا شروع کر دیتی ہے جو آج تک دل کی آنکھوں پر پڑتے رہے تھے جن حقائق صادقہ کو کل تک وہ فراموش کر دینے میں کامیاب ہو جایا کرتا تھا آج ان سچائیوں سے انکار کرنا اپنے آپ کو جانتے ہوئے فریب دینا محسوس ہوتا ہے وہ خدا اور عالم آخرت سے انکار کرتا تھا مگر آج جبکہ اغراض کا ہر پردہ اٹھ چکا ہے وہ دل کی گہرائیوں میں ایک عظیم تر طاقت کا وجود، اس کی آمریت اور اس کے بے پناہ قوانین کی گرفت کو محسوس کرتا ہے۔ اس کا دل کہتا ہے کہ مجھے ہمیشہ کے لئے موت نہیں آ رہی بلکہ اس موت کے دروازہ سے کسی دوسری دنیا میں لے جایا جا رہا ہے اور دنیا بھی ایسی جہاں میری ہر لغزش پر باز پرس ہوگی۔ مرنے والے کے پاس نہ اس یقین کے دلائل ہوتے ہیں نہ برزخی مناظر کے مشاہدات بلکہ خود اس کی ہستی کا ہر ذرہ پکارتا ہے کہ خدا ہے اور دوسری دنیا بھی۔

اضافاتِ حیاتیہ کے انقطاع نے جو پاکیزگی، نازک احساس اور لطافت پیدا کر دی تھی اس کا تقاضا ہی یہ تھا کہ ان صداقتوں کا اقرار کیا جائے جن کا آج تک انکار کیا جاتا رہا۔ خدا اور عالم آخرت کا یقین اس کے ہر رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتا ہے۔ ایمان بالغیب رکھنے والے مسلمان کی اس بارے میں کوئی تخصیص نہیں۔ بڑے سے بڑا دہریہ بھی موت پڑ ان کہی کہہ اٹھتا ہے۔ خواہ اس کی یہ توجیہ موروثی خوف کے تاثر سے کیوں نہ کی جائے۔ یہی وہ حق، صداقت اور یقین ہے

جس کا قرآن نے دعوے کیا تھا۔

وجاءت سکرة الموت بالحق ذلك — اور موت کی بیہوشی سچائی کو لے کر آگئی یہی ہے

ما كنت منه تحيد (ق) — وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا۔

مفسرین نے اس آیت کی توضیح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی میرے مدعا کے خلاف نہیں۔

كشفت لك عن اليقين الذي — تیرے اس یقین کے پردہ کو کھول دیا گیا جس میں

كنت تمتري فيه (حافظ ابن کثیر) — تو شک کرتا تھا۔

ويظهر له صدق ما جاءت به الرسل — اور پیغمبر جب قیامت اور جزا سزا کی خبریں لیکر

من الاخبار بالبعث والوعد والوعيد (قاضی شوکانی) — آئے تھے ان کی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے۔

وغیرہ تفسیریں بالکل میری تائید میں ہیں ان سے ہرگز اس کا شبہ بھی پیدا نہیں ہوتا کہ "سکرات کے وقت حقیقت کا کوئی منظر سامنے ضرور آجاتا ہے" خود سید صاحب موصوف نے بھی "بہر حال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے" فرماتے ہوئے میرے ہی خیال کی تائید فرمائی ہے مجھے اس قول میں صرف "بالکل" سے اختلاف ہے جبکہ خود سید صاحب بھی کشفِ نزعی کو "کسی قدر کشف" فرما چکے ہوں تو پھر "بالکل پردہ" اٹھ جانے کے کیا معنی ہوں گے؟ یقین کا پردہ اٹھتا ہے اور ضرور اٹھتا ہے مگر اس ہی نوع کے یقین کا جو ہم کسی معتبر تاریخی واقعہ یا ان متمدن مغربی ممالک کے جمیل ترین مناظر کے متعلق رکھتے ہیں۔ جن کو ہم نے آج تک خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ قرآنِ کریم کی حسب ذیل آیت اس ہی نکتہ کی وضاحت کرتی ہے۔

حتى اذا جاء احدهم الموت قال — جب ان کافروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے

رب ارجعون لعلي اعمل صالحا — تو وہ کہتا ہے اے پروردگار مجھے واپس کردے

فيما تركت كلا انها كلمة هو قائلها — تاکہ جو مال میں نے چھوڑا ہے اس سے شاید کوئی

ومن ورائهم برزخ الى يوم — نیک کام کرسکوں ہرگز نہیں یہ بات ہی بات ہے

يبعثون (مومنون - ٦) — جو وہ کہتا ہے اور ان کے پیچھے اس دن تک پردہ ہے جب

برزخ کے ہیبت ناک مناظر ان ہی کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کون ایسا ہو سکتا ہے جو اپنے وعدہ کو شکست کر سکے ایک ہولناک خواب کئی کئی گھنٹے اور کئی کئی روز پریشان رکھتا ہے جیل خانہ کا سیاہ پھاٹک اور لاٹھی چارج کا منظر سیاسی تحریکات میں باوجود قومی تعمیر کا احساس رکھنے کے بہت سے لوگوں سے شرکت کی ہمت سلب کر لیتا ہے۔ سم خوردگی کے تجربات ہر سمیت سے عمر بھر کے لئے لرزہ براندام کر دیتے ہیں۔ پھر برزخی مناظر ہی میں وہ کونسی کمزوری تھی جن کی بنار پر اس کی دوزخ کے بے پناہ شعلے بھی چند روز کے لئے ذہن پر نقش نہ ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی نگاہوں کو کسی منظر نے مس نہیں کیا اس نے کچھ نہیں دیکھا مگر دل کی اس معصومانہ لطافت و تاثر نے جو چند لمحات کے لئے اضافاتِ حیاتیہ کی تاریکیوں سے پاک ہو گئی تھی فطرت کے اس اعترافِ حقیقت کو بیدار کر دیا جو" الست بربکم" کے جواب میں کہا گیا تھا۔ انسان کا ہر کفر و ریب مادی ماحول سے وابستگی کا نتیجہ ہے ورنہ فطرت کا تقاضا حقائق پرستی کے سوا کچھ نہ تھا۔ نزع نے مادی ماحول کی ہر کشش سے قوائے انسانیہ کو آزاد کر دیا اور اس طرح ہر انکار اقرار میں تبدیل ہو گیا۔ ورنہ احساسات تبدیل ہو جاتے پر اس اقرار کا انکار ہو جانا کچھ مستبعد نہیں۔ شاہ اسمٰعیل صاحبؒ نے طبقات صفحہ ۱۳۹ میں اہل سعادات کے مدارج بتاتے ہوئے اس ہی نکتہ کو واضح فرمایا ہے۔

وھو ای کشف العلم بباریہ لا یتاتی	وجود باری کا کشف تہذیب نسمہ اور اس کی صفائی
الا بعد تھذیب النسمہ ای بعد	و شفافیت کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اس کے تمام
تصقلہ لاطمینان قوا ئھا عن	قوائے اور حواس پریشانیوں سے پاک اور مطمئن
التشویشات ھذا ولہ میل الی	ہو جاتے ہیں اور وہ پاکیزگی خدا کی طرف ایک
حظیرۃ القدس لا من جنس العشق	کشش رکھتی ہے۔ عشق و محبت اور طلب و
والمحبۃ والطلب بل من جنس	آرزو جیسی نہیں بلکہ اس قسم کی کشش جو ہر عنصر کو
میلان کل عنصر الی حیزہ ۔	اپنے مرکز کی طرف ہوتی ہے۔

موت کے وقت جو حقائق روحانی سے کشش، خدا کے وجود کا یقین و کشف اور عالمِ اخروی کا تصور

پیدا ہوتا ہے وہ اہلِ سعادت کے اس ہی اولین درجہ کے مثل تھا۔ نسمہ کی تہذیب اور روحِ طبعی کے آئینہ کی شفافیت۔ تشویشات اور اضافات حیاتیہ سے آزاد و مطمئن ہوجانے پر پیدا ہوا کرتی تھی اور وہ نزع موت کے یقین اور تمنائیں دفن ہوجانے سے پیدا ہوگئی۔ نتیجہ وہ ہی کشف و یقین ہونا چاہیے تھا جو خطیرۂ قدس سے عنصری جذب و کشش رکھتا ہو۔ بس یہ ہی وہ حقیقت ہے جو موت پر جذبِ روحانی کی تخلیق کرتی ہے مگر کسی منظر کو سامنے نہیں لاتی اور یہ ہی وہ اعترافِ حقیقت تھا جسے دنیا کی دلچسپیوں میں ایک مرتبہ پہلے بھی فراموش کیا جا چکا ہے۔ اگر نزع کی کشمکش کو دوبارہ زندگی میں تبدیل کردیا جائے تو زندگی کی مقناطیسی جاذبیت اس کی توجہات کو پھر حقیقت سے ہٹا کر فریب و مغالطہ کی ٹھوکروں میں ڈال دے گی اور جو وعدہ اس نے نزع کی حالت میں کیا تھا وفا نہ ہوسکیگا۔ زندگی کی دلچسپیاں انسانی دل و دماغ کو ماؤف کرنے کی اس قدر طاقت رکھتی ہیں کہ کوئی یقین ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ داد عیش دینے سے صحت خراب ہوکر زندگی موت سے بدتر ہوجاتی ہے مگر فردوسِ گوش اور جنت نگاہ میں پہنچتے ہی ہم از خود رفتہ ہوجاتے اور ہر حقیقت کو ٹھکرا کر دادِ عیش دینے لگتے ہیں کیوں؟ اس لئے نہیں کہ یقینی نتیجہ کا کوئی عمیق ترین اعتقاد بھی ہمارے جذبات میں زندہ نہیں بلکہ "نسیہ" کو "نقد" پر ترجیح نہ دینے کا جو مالیخولیا گوناگوں انجذابات نے پیدا کردیا تھا وہ حقیقت کی بجائے فریبِ نظر کو بوسہ دینا ہی پسند کرتا ہے اور یوں وہ تمام یقینات عملی دنیا میں بے معنی ہوکر رہ جاتی ہیں جن کو جمالیاتی موثرات اور نفسیاتی انجذابات کی قیود و بند سے باہر آکر ہم پوری طرح محسوس کرتے اور رنج و تاسف کے عذاب میں مبتلا ہوجاتے ہیں یہ ہی وہ نکتہ ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا اور یہ ہی وہ کشف ہے جو موت کے وقت محسوس ہوتا اور زندگی میں فراموش ہوجاتا ہے۔ حقیقت کا منظر نہ سامنے آتا ہے نہ فراموش ہوتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی نہ کسی حد تک اس مسئلہ پر جو کچھ عرض کرچکا ہوں وہ کافی ہوگا لیکن اگر کسی علمی تنقید نے مجبور کیا تو دوسرے پہلو بھی روشنی میں لانے کی کوشش کروں گا۔

(باقی دارد)